کشتِ ویراں: چائے والا اور بازارِ مصر

تحریر: حامد کمال الدین

معاملے کی وہ جہت تو "دلیل" پر شائع ہونے والا ایک مضمون باحسن انداز دکھا چکا: "گوشت کے بیوپاری"۔ ایک دوسری جہت پر کچھ ہمیں بات کرنی ہے۔ وہ بیوپار تو اپنے معمول پر ہی ہے: مال جانچا، پیسے دیے، کسی پر احسان کیسا، انوسٹمنٹ ہے! مہنگا مال سستے داموں اٹھانا، کاروبار اِسی کا نام ہے، سو جتنا ہاتھ پڑے! لیکن کیا ایسا واقعہ آپ کے خیال میں ہوا ہو گا کہ کچھ "روح" کے طرفدار بھی موقع پر اُس آفت رسیدہ (victim) کے پاس پہنچے ہوں؟

بطور ایک فرد، میں اُس کے شہر میں ہوتا تو کم از کم اُس کے پاس سے ضرور ہو کر آتا۔ اُس کا ایک مول اُس کو "گوشت" والوں اور والیوں نے بتایا ہو گا۔ اُس کا ایک مول اُس کو میں بتا کر آتا۔ فیصلہ ظاہر ہے اُسی کو کرنا تھا۔ لیکن وہ اِسی معاشرے کا ایک بچہ ہے جہاں "انسان" کا حقیقی مول کم ہی پڑھایا بتایا جاتا ہے۔ ارشد کسی اسکول میں پڑھا ہوتا تو اپنا یہ مول شاید وہ پھر بھی نہ جانتا۔ اِس کے لیے تعلیم کی ضرورت ہے جو فی زمانہ اسکولوں میں ناپید ہے، ارشد کو یہ کہاں سے میسر آتی؟ تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے، امکان تھا کہ ہمارا یہ بچہ، بلکہ ہمارا کوئی بھی بچہ، گوشت اور چمڑی کی منڈی میں اپنے ہوش کھو بیٹھتا۔ اور تعلیم تو ظاہر ہے ایک مسلسل عمل ہے۔ فوری طور پر تو تبلیغ ہی ہو سکتی ہے۔ جبکہ تعلیم معاشرے میں ایک اساس سے اٹھایا جانے والا عمل، جو مسلم معاشرے میں آنکھ کھولنے والے ہر بچے کا حق ہے۔ تعلیم کی راہ سے ایمان اور قدریں سینوں میں

بٹھائی ہوتیں تو امکان تھا ہمارے اس بچے سے کسی مائک والی کو ایک بے ساختہ جواب یوں بھی ملتا کہ: میں ایک پٹھان عزت دار بچہ ہوں، محنت مزدوری کرنا تو ہمارے یہاں فخر کی بات ہے مگر بھانڈ ہونا یا چمڑی کی نمائش پر پیسے لینا معیوب، خواہ وہ کتنے ہی ہوں۔ عزت کے آگے پیسہ کیا ہے؟ یہ بات سننا ظاہر ہے سرمایہ داری عقیدہ اپنے منہ پر ایک تھپڑ سمجھتا اور اس کی بازگشت دور دور تک سنی جاتی۔ جبکہ ہمارے بچے کے لیے یہ ایک لااُبالی جواب۔ بلاشبہ ہمارا ہر ہر بچہ آج اُس پیسہ دے کر نچانے والے کو دُور سے یہ آئینہ دکھا سکتا اور قدروں کی رکھوالی میں اِس گھر کا محافظ بن سکتا تھا۔ 'ساقی' ستر سال گزر جانے کے باوجود یہاں 'نم' کا 'ذرا' بھی بندوبست نہ کر سکا، ورنہ اپنی مٹی کی یہ زرخیزی ارشد کی نیلی آنکھوں سے بڑھ کر آج دنیا کو حیران کرتی۔ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ۔ لیکن ابھی تو یہی خاک اڑتی ہے۔ عزت پانے کا اعلیٰ ترین تصور یہ کہ آدمی بالی وڈ تماش بینوں کے آگے اچھل مٹک کر دکھائے اور اس پر مہنگا ٹکٹ لگے!

پس تعلیم کا رونا تو ایک حقیقی رونا ہے۔ کم از کم فہمائش کے لیے ہی میں اور میرے جیسے اُس شہر کے درجنوں اور سینکڑوں نمازی اُس بازار میں اپنے اپنے سوت کی اَٹی لیے پہنچتے۔ 'زنانِ مصر' سے چاہے پھر بھی کوئی مفر نہ ہوتا، مگر 'یوسف' کی ایک کہانی تو کم از کم کسی 'سوت والی' کے بغیر نامکمل رہتی! میں کہتا ہوں اپنے کسی بھی شہر میں ایسی کوئی ایک بھی کہانی اپنے اِس 'سوت' کے بغیر کیوں مکمل ہو؟ کیا لگتا ہے اس پر؟ کیا اس کردار کے بحال رکھنے پر آج کوئی پابندی ہے؟ یا ہم ہی زمانے کے اسٹیج سے واپسی کی راہ لے چکے اور زندگی کی وہ چنگاری سرد کر چکے؟

حضرات اس پر ہمیں سوچنا تو ہے کہ مسجدیں آج زندگی کی دوڑ سے کیوں باہر ہیں! تہذیبی کشمکش کی گلیاں

نمازیوں سے بالکل سونی اور ویران! عبادت گزاروں کے یہاں ایک سماجی صلاحیت کا ہونا، کاروبارِ حیات میں ان کا زورآور اور چابکدست ہونا، ایک تہذیبی فاعلیت سے لیس ہونا، یہ بھی ہم سنتے تو آئے تھے! انیشی ایٹو initiative لینا دینداروں کے لیے آج کیسی ایک اجنبی اور انہونی بات ہو چکی! جام کو بڑھ کر تھام لینے کی وہ چلبلی ادا رُوپوش! زندگی کے سٹیج پر کوئی ہو، ہمیں تو خبریں پڑھنی ہیں، اخبار لیٹ ہو جائے تو البتہ تشویش ہوتی ہے! ایسا بے امنگ اور بے ترنگ passive بھی ہمارا دینی سیکٹر اِس سے پہلے کبھی ہوا ہو گا؟ نرا 'آرڈی ننسوں' کا منتظر! بیٹھا 'خلافت' کی راہ تکنے والا! 'مہدی کی آمد قریب آ لگنے' سے متعلق پورا ایک لائبریری شیلف بنا رکھنے والا! یاجوج ماجوج کا کھوج لگاتا پھرتا، دجال کے پیچھے برمودا ٹرائی اینگل جا پہنچتا، زمین سے نکل چاند پر اپنی مراد کی تصویریں ڈھونڈ لینے اور اپنی عقیدت کی عبارتیں پڑھ لینے والا، اپنے محلے کی بیوہ، یتیم، مسکین اور مظلوم سے بے خبر، اپنی بستی کے دجالوں کے آگے بے بس، تاثیر اور فاعلیت سے تہی، اپنی دنیا سے بیگانہ مسلمان! ہار جیت ہونا تو صاحبو اِس جہان میں کوئی بڑی بات نہیں، وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ، لیکن اس کی نوبت تو تب ہو جب میدان میں کوئی پایا گیا ہو! یہ جو کچھ آج ہو رہا ہے اس کو 'ہار' بھی کس منہ سے کہیں، یہ تو نرا یکطرفہ معاملہ ہے!

غرض نمازیوں کی دلچسپی کے یہ بھی کچھ کام ضرور تھے! حاجیوں اور عمرہ گزاروں کے تھوڑی توجہ کر لینے کی یہ بھی ایک چیز تھی! سنت کی بابت دقیق پیمائشیں رکھنے اور ہر کسی سے جھگڑ آنے والوں کے 'پریشان' ہونے کی یہ بھی ایک بات تھی! نیکوکاروں اور 'نظر نیچی رکھنے والوں' کے جُتنے کا یہ بھی ایک محاذ تھا! کوئی حرج تو نہیں تھا کہ یہ بھی یہاں کے ارشدوں کے پاس پہنچ لیے ہوتے! ناں ہو جاتی، واپس گھر تو آنے دیا جاتا!

حضرات وخواتین! یہاں محض ایک واقعہ سے اپنا ربط ڈھونڈنے کی کوشش ہو رہی ہے، ورنہ ایسے وقائع روز ہوتے ہیں، جتنے مرضی پڑھ لیجئے۔ "منہج التربیۃ الاسلامیۃ" میں استاذ محمد قطب سے ہم نے یہ پڑھا کہ صحابہ کو اسباق دلانے کے معاملہ میں ہمارے نبی ﷺ کوئی عملی موقع نہ چھوڑتے اور کسی روزمرہ واقعہ کو اپنی پوری قیمت دیے بغیر جانے نہ دیتے۔ راستے میں بکری کا ایک بچہ مرا پڑا دیکھا تو صحابہ کو اس کی طرف متوجہ کر کے کمال اسباق ذہن نشین کرائے۔ بِأَبِي هُوَ وَأُمِّي، علیہ السلام۔ قوموں میں جوت جگانا ایک خاص سوچ اور توجہ چاہتا ہے۔ یہ ہو تو قدم قدم پر بولتی ہے۔ ماہرینِ تربیت بھی آج یہی کہتے ہیں کہ نظری اسباق کبھی اتنے فائدہ مند نہیں ہوتے جتنی کہ روزمرہ حیات کی واقعاتی آموزش۔ سواِس باب سے، یہاں چند باتیں ہو رہی ہیں۔ لکھنے والا پڑھنے والوں سے بڑھ کر ہی قصوروار رہا ہو گا، اللہ ہم سب کو معاف فرمائے۔ ایک تہذیبی فاعلیت کی جانب کو رخ کرنا نمازیوں پر لازم ضرور ہے۔ آیئے اس پر توجہ کریں۔ خدا کا شکر ہے خیر کی کچھ کمی ہمارے یہاں نہیں۔ بس ایک بات اگر ہو جائے: سیلف انیشی ایٹو self-initiative لینا اگر ہمارے اِس بھلے مانس دیندار کے اندر آجائے، جو کہ فاعلیت کا اصل ظہور ہے، تو شاید یہ سارا پانسہ پلٹ جائے۔

قَالُوا مَعْذِرَةً إِلَىٰ رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ

البتہ زیادہ باہمت یا زیادہ باوسائل اصحاب کے انیشی ایٹوز initiatives بھی بڑے ہوں گے، خصوصاً اگر وہ کوئی گروپ یا جماعتیں ہوں۔ یا وہ کچھ 'پراجیکٹس' میں ڈھل سکنے والے دماغ اور صلاحیتیں ہوں۔ اپنی تہذیبی کشمکش میں یہ مسائل جو اَب کسی نہ کسی صورت ہمیں آئے روز پیش آنے لگے، کچھ زیادہ گہرے اور پائیدار حل مانگتے ہیں۔ ایک فرد میں اگر فاعلیت جگا بھی لی جائے، وہ تو واقعہ پیش آنے پر ہی مقدور بھر کچھ

کرے گا۔ وہ بھی اپنی جگہ ضروری ہے، منبر و محراب کو اپنا یہ گمشدہ 'فرد' بھی اِس تہذیبی معرکہ کے اندر بازیاب کرانا ہو گا۔ البتہ ایک 'گروپ' یا ایک 'پراجیکٹ' اِس کھیل میں پہلے سے وکٹ پر جم کر کھڑے تیار چوکس بلہ باز کی طرح وقائع کی 'گیند' پر نظر رکھتا ہے جو ابھی ہوا میں ہوتی ہے، اور اس کے پہنچنے سے پہلے وہ اس کے لیے اپنی 'سٹروک' کا تعین کر چکا ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں ایسے مستعد ادارے جو اپنے ریسرچ اینڈ ڈویلپمنٹ سیلز کے ساتھ دُور سے آتی 'گیند' کے لیے مناسب ترین اور بروقت ترین سٹروک کا تعین کریں، ہمارے دینی سیکٹر کی اشد ضرورت ہیں اور ہمارے کچھ باصلاحیت لوگوں کو اس کے لیے آگے آنا ہو گا۔ اور پھر صرف 'بیٹنگ' نہیں، کھیل میں 'باؤلنگ' بھی ہوتی ہے۔ یہ سطح لامحالہ 'فرد' سے اوپر کی ہے۔ 'افراد' اور 'وسائل' کو ایک بڑے پیمانے پر جوت کر کچھ زورآور مقاصدِ حق کو برلانا اور کچھ خوفناک اجتماعی خطرات سے نبردآزما ہونا باقاعدہ 'ادارے' اور 'پراجیکٹس' مانگتا ہے۔ اس کے بغیر یہ کھیل ہمارے کھیلنے کا نہیں ہو گا۔ اس کے نہ ہونے کی صورت میں ہمارا 'فرد' ایک سطح پر میدان سے باہر 'پیویلین' pavilion میں ہی اپنی حاضری لگوا سکے گا اور اپنا تمام جوش و خروش اور اپنے سب 'ایمانی جذبات' وہیں پر ہلکے کرتا رہے گا۔ بلاشبہ بہت سے تماشائی کھلاڑیوں سے زیادہ تھک ہار کر سوتے ہیں! البتہ اگر آپ کے پاس پراجیکٹ اور ادارے ہوں تو آپ اِس 'فرد' کو لے کر میدان کے اُس حصے میں اتر سکتے ہیں جہاں سے آپ کھیل کے 'نتائج' پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

میرے علم کی حد تک، امت کی تہذیبی جنگ کے لیے پیش بندی اور منصوبہ بندی کرنے والے کوئی ادارے آج یہاں ہمارے پاس نہیں ہیں۔ ملک میں لبرل یلغار کے مقابلے پر اسلامی ایجنڈا کے لیے راتیں

جاگنے اور ذہانت سے مہرے ہلانے والے کوئی مختص گروپ یہاں بر سر عمل نہیں ہیں۔

کیا خیال ہے ایسے کوئی ادارے اگر یہاں مستعد بیٹھے ہوتے تو چائے والے کے معاملہ میں چھوٹا موٹا انیشی ایٹو initiative ہمارے لیے کوئی بڑی بات تھی؟ اصل چیز تو اپنے اس بچے کے اندر قدروں پر یقین کو جگانا ہی ہوتا، اور ہدایت اللہ کے ہاتھ میں ہے، جس پر نہ ہمارا دعویٰ، نہ مایوسی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ لڑکے پر شوبز والوں کے مقابلے کی بولی لگا دی جاتی۔ لیکن ایمانی فہمائش کے ساتھ ساتھ، اس کو ایسا بھی تو کچھ سجھایا جا سکتا تھا کہ جتنی سی شہرت اس کی نیلی آنکھوں کو مل چکی وہ اس کے کسی موقع کے ریستوران کو مقبول کروانے میں بھی مددگار ہو سکتی ہے اور وہاں ان 'ناریوں' کو چائے یا پکوان بیچنا ان کے آگے کولہے مٹکانے سے کہیں بہتر ہے؟ دینی سیکٹر اس بات سے عاجز تو نہیں تھا کہ شوبز والوں کے مقابلے پر ارشد کو کسی اچھے باعزت حلال بزنس میں مدد کی پیشکش کروادی جاتی۔ اور کچھ نہیں، کسی حاجی صاحب کا ریسٹورنٹ ہی میدان میں آجاتا۔ یہ تو وہ ملک ہے جہاں غلام احمد بلور نامی ایک فرد امریکہ میں بیٹھے ایک شخص کے سر کی قیمت لگا دیتا ہے۔ بڑھ چڑھ جانے پر آئے، لوگ کروڑ کروڑ کی گائے قربان کر کے گوشت محلے میں بانٹ دیتے ہیں۔ غرض ارشد کو ہماری جانب سے کسی چھوٹی موٹی آفر کی خبر آنا کیا بڑی بات تھی۔ سوت کی اَٹی ہی سہی، دینی سیکٹر کی ایک انٹری تو لگتی۔ معاملے کا ایک فریق نظر آنے میں آخر کیا مسئلہ ہے؟

'چائے والا' تو محض ایک مثال تھی جو ایک بحران کی جانب توجہ دلانے کا بہانہ بنی۔ اصل میں یہاں ایک خلا ہے جسے پُر کرنا اور اس جانب توجہ لینا ضروری ہو گیا ہے۔ پچھلے دنوں ایک نیک خاتون کا ویڈیو کلپ نظر سے گزرا جو کسی ٹی وی چینل پر مارننگ شو کرتی رہی تھی۔ لیکن دل کی آواز پر اس نے سر ڈھانپنے کا ایمانی

فیصلہ کیا اور، حسبِ توقع، جاب کھو بیٹھی۔ متبادل ذریعۂ معاش سے متعلق اپنی سرگزشت سناتے ہوئے خاتون ایک مقام پر آبدیدہ بھی ہوئی۔ ٹھیک ہے وہ کامیاب ہوئی اور خدا نے اس کو سرخرو کیا۔ لیکن اسلامی سیکٹر اس خاتون کے معاملے میں کہاں تھا، جو چینلوں پر بے دینی کی دُہائی دینا کسی وقت نہیں بھولتا؟ کیا یہودی یا عیسائی یا ملحد بھی اپنے عقیدے کی خاطر جاب کھو بیٹھنے والے کسی شخص کو یوں بے یار و مددگار چھوڑتے؟ میرا خیال ہے وہ اسے سر پر بٹھاتے، یہ ہیرے صرف ہمارے ہاں رُلتے ہیں۔

وَالَّذِينَ كَفَرُوا بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ إِلَّا تَفْعَلُوهُ تَكُن فِتْنَةٌ فِي الْأَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيرٌ (الانفال: 73) "کفر کرنے والے بھی ایک دوسرے کے رفیق و مددگار ہیں۔ مومنو! تم اگر یہ کام نہ کروگے تو زمین میں ایک فتنہ ہوگا اور ایک بڑا فساد"۔

ایک اور واقعہ ہمارے ایک قریبی دوست نے سنایا۔ چند برس پیشتر ایک خداشناس عالم جو کسی مدرسہ کے دارالافتاء میں تعینات تھے، آلو چپس کی ایک مشہور کمپنی نے ان سے کوئی فتویٰ مانگا مگر وہ اس کی طلب کا فتویٰ دینے پر مطمئن نہ تھے یہاں تک کہ مدرسہ والوں نے ان پر جب فتویٰ دینے کے لیے زور ڈالا اور وہ مسلسل انکاری رہے تو انہیں اپنی جاب سے ہاتھ دھونا پڑے۔ مفتی صاحب بڑے مہینوں تک بے روزگار، آخر چولہا سرد پڑنے کو آیا۔ بھئی عالم کیوں اپنی مالی تنگی کا اظہار گوارا کرے؟ 'امت' بھی تو کسی دکھ کا مداوا ہو! کیا واجب نہ تھا کہ اپنی علمی صوابدید پر اصرار کرنے والے ایک عالم کو یہاں سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا؟ ہم وہ قوم جو حق گو علماء کے 'واقعات' میں تو رغبت خوب رکھتی ہے مگر آزمائش میں ان کے ساتھ کھڑے ہونا ذہن میں نہیں آتا!

گلہ مگر قوم سے نہیں، چارہ گروں سے ہے۔ امت نہ بخیل ہے اور نہ ایسے کسی محاذ سے رُو گرداں۔ امت سے جو مانگا گیا، آج تک اس نے وہ دیا ہے۔ بس ہم ہی بعض امور کو انجام دینے کے مناسب چینل اسے فراہم نہیں کر سکے۔ لوگ دراصل کچھ خاص روایتی مدّات میں ہی چندے دینے سے مانوس ہیں، اور وہاں بے شک کمی نہیں کرتے۔ ان نئ ضرورتوں کی جانب ان کو لے کر چلنا اور انہیں راستے بنا کر دینا البتہ خواص کا کام ہے جو ذرا ایک قوتِ اقدام مانگتا ہے اور کسی حد تک تخلیقی صلاحیتیں اور اَن چلی راہیں روند ڈالنے کا حوصلہ۔ یہ میدان توجہ دلانے والوں سے ہی آج بہت حد تک خالی ہے۔ 'کارپوریٹ دنیا' میں اپنے جینے survival کے لیے اب ہمیں کچھ پہلے سے مختلف چارہ جوئی کرنا ہو گی۔ معلوم ہونا چاہئے، 'فرد' اور چھوٹے چھوٹے غیر منظم ادارے اور ٹھیلے اِس درندے کی من پسند غذا ہیں۔ اِس میدان میں آج ہمیں ایک بالکل نئ تیاری کے ساتھ اترنا ہو گا۔

میرے خیال میں ایسے وقف سامنے آنا ضروری ہیں جو سماجی میدان میں لادین ایجنڈا کے مقابلے پر ہمیں ایک پیش بند pro-active انداز میں عمل کی پوزیشن میں لے کر آئیں۔ جبکہ ہم وہ قوم جو دنیا میں ''اوقاف'' متعارف کروا آئی ہے۔ ہماری تاریخ اس معاملہ میں ناقابل یقین مثالیں پیش کرتی ہے۔ ایک عشرہ پیشتر مجھے چند عرب ملکوں کی سیر پر جانے کا اتفاق ہوا۔ دمشق میں میرے میزبان نے شہر کے ٹی وی سٹیشن کے آس پاس کہیں ایک جگہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا: جانتے ہو یہاں کبھی ایک وقف ہوتا تھا اور تم تعجب کروگے کہ وہ کس مد کے لیے تھا؟ اتنا میں جانتا تھا کہ دمشق اسلامی تہذیب کا پرانا گڑھ ہے ضرور کوئی خاص بات ہو گی۔ کہنے لگا: دمشق اور اس کے گردونواح میں لوگوں کے وہ پالتو جانور جو ذبح نہیں ہو سکتے مانند

گھوڑا، گدھا، خچر وغیرہ، عمر رسیدہ ہو جانے پر جب گھر والوں کے لیے بے کار اور اُن پر ایک بوجھ ہو جاتے، تو بعض مالکان ان کی نگہداشت میں کوتاہی کر جاتے۔ جانوروں کے ساتھ یہ زیادتی مسلم معاشرہ گوارا نہ کر پایا؛ کچھ لوگوں کے ذاتی انیشی ایٹو initiative پر ایک وقف تشکیل دیا گیا کہ جو آدمی اپنے ناکارہ جانور کا حق ادا کرنے سے قاصر ہے وہ اسے یہاں چھوڑ جائے جہاں وقف کے اموال سے اس کی نگہداشت کی جائے گی۔ (واضح رہے ہماری اکثر تعلیمی، تہذیبی اور عمرانی سرگرمی قصرِ سلطانی کے 'فنڈ' اور 'آرڈی ننس' کی محتاجی سے نابلد رہی ہے۔ ہماری فقہ اور ہماری تہذیب سیلف انیشی ایٹو self-initiative کا ایک جیتا جاگتا نمونہ اور منبع چلی آئی ہے؛ آج اسی "خودکار فاعلیت" کی نیم سرد چنگاری کو شعلۂ جوالہ بناڈالنا ہمارے منبر و محراب، مسندِ علم، خانقاہ، قلم اور کلاس روم کو درپیش اصل چیلنج ہے)۔ غرض اسلامی تہذیب جب جوان تھی تو ایک بوڑھا جانور تک نمازیوں کے دیس میں رُل نہ سکتا تھا۔ (ہمارے سلاطین اُن دنوں بھی اللے تللے فرما ہی لیتے تھے۔ 'سٹیٹ' نامی جکڑ البتہ نہ تھی، یہ ایک نئی بلا ہے)۔ مگر آج ہمارا کیسا کیسا نوخیز انسانی سرمایہ رُلنے لگا اور خام مال کنٹینروں میں لدا، بے دینی کے کباڑ میں نمک کے بھاؤ تُلنے لگا، ہمارے کیسے کیسے خوبرو ارشد آج شوبز کا لنڈا پہن اپنی امت کی مفلسی کا پوز اترواتے ہیں، لمحۂ فکریہ ہے۔ قوموں کی حیاتِ اجتماعی کا ایک بڑا بحران سب کچھ پاس ہوتے ہوئے انیشی ایٹو initiative نہ لے سکنا ہے۔ ایسی قوموں کی ادبیات حالات کا رونا رُلانے میں البتہ کمال پیدا کر لیتی اور اسی کو ایک کام سمجھتی ہیں!

اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنْ الْهَمِّ وَالْحَزَنِ، وَأَعُوذُ بِكَ مِنْ الْعَجْزِ وَالْكَسَلِ، وَأَعُوذُ بِكَ مِنْ الْجُبْنِ وَالْبُخْلِ، وَأَعُوذُ بِكَ مِنْ غَلَبَةِ الدَّيْنِ، وَقَهْرِ الرِّجَالِ